(غلام گردش)

تاریک گلیوں کے سورج

ذہانت کیا چیز ہے؟ کیا اسکی تقسیم دنیا بھر کے لوگوں میں ایک جیسی ہے! مواقع "Opportunities" کس طرح افراد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ تھامس ایڈیسن دنیا کا عظیم ترین سائنسدان تھا۔ اس نے سو کے قریب ایجادات کیں۔ وہ ذہانت کے معاملے میں فکرمند نہیں رہتا تھا۔ ایڈیسن کہتا تھا کہ ذہانت کا زندگی میں کردار صرف ایک فیصد ہے۔ بقیہ ننانوے فیصد انسان کی ذاتی محنت اور کاوش ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ انسان اپنی محنت کے بل بوتے پر ذہانت کی ہر معراج کو چھوسکتا ہے۔ اسکی دانست میں لوگوں کو قدرت کی طرف سے تقریباً ایک جیسی ذہنی اسطاعت سے نوازا گیا ہے یعنی صرف ایک فیصد۔ آپ "ایڈیسن" سے اختلاف کر سکتے ہیں مگر اس سائنسدان نے اپنی محنت کی بدولت آج کے انسان کی زندگی کو مکمل تبدیل کر دیا۔ اسکی بلب کی ایجاد ہی تمام تر روشنی کا ہرکارہ بنی۔

مگر اہلیت کیا ہے؟ کیا اہلیت ذہانت کا نعم البدل ہے۔ یہ بھی ایک اہم نکتہ ہے۔ اہل لوگ میری دانست میں ذہین لوگوں سے قدرے مختلف ہوتے ہیں۔ اہلیت اور محنت اگر مل جائے تو پھر وہ لوگ قوموں کی قسمت کا دھارا بدل دیتے ہیں جیسے ابراہم لنکن یا نیلن مینڈیلا۔ لیکن ایک عنصر ان لوگوں کے اختیار سے بھی باہر ہوتا ہے۔ وہ ہے زندگی یا نظام میں اپنی اہلیت اور ذہانت کے حساب سے مواقع (Opportunities) پیدا کرنا! اہلیت کو پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کرنا ہی دراصل کسی ترقی یافتہ ملک یا نظام کا کمال ہے۔ ذرا تدبر کیجئے! کہ اگر ڈاکٹر مہاتیر محمد ہمارے ملک میں پیدا ہوتا تو کیا وہ ملک کا صدر یا وزیراعظم بن سکتا تھا۔ ہمارا نظام اس جیسی آزاد سوچ رکھنے والے لوگوں کو اپنا بدترین دشمن گردانتا ہے۔ آپ دنیا کے کسی مہذب ملک میں نظام کا جائزہ لیں۔ وہ ذہانت کو اہلیت میں بدل دیتے ہیں۔ اور ان دونوں کو ملا کر اپنے ملک کے لیے عظیم سائنسدان، مفکر، ماہر معاشیات اور لیڈر پیدا کر لیتے ہیں۔ اسکے بعد ہمارے جیسے ملک انکی ٹھوکروں میں پڑے ہوتے ہیں۔

آپ کسی بھی اسلامی ملک کو دیکھیے۔ آپکو ذہانت، اہلیت اور مواقع کا توازن نظر نہیں آئیگا۔ میں ملائشیا اور ترکی کو آج بھی ترقی پذیر ممالک سمجھتا ہوں۔ یہ دونوں ممالک ترقی کے میدان میں مغرب کے مقلد ہیں، اس کھیل کے کپتان ہرگز نہیں! یہ ہم سے بہتر ضرور ہیں مگر اصل ترقی یافتہ ممالک سے کوسوں دور! آپ اپنے ملک کو دیکھیے! ہمارے حکمران ان تینوں عناصر کو ماننا یا تسلیم کرنا تو دور کی بات، ان سے گھبراتے ہیں۔ کیا ہمارا کوئی سیاسی قائد ذہین اور اہل وزیر کو پسند کرتا ہے۔ ہرگز نہیں! بلکہ وہ تو اس طرح کے سیاسی ورکروں کے سائے سے بھی ڈرتے ہیں! بنیادی وجہ صرف ایک ہے۔ اوسط سے بھی کم درجے کی ملکی قیادت ہمارے سیاسی قائدین کو اندر سے علم ہے کہ وہ اس ملک کے ٹوٹے پھوٹے نظام میں نقب لگا کر آگے بڑھے ہیں۔ لہذا وہ میرٹ سے گھبراتے ہیں بلکہ میرٹ سے نفرت کرتے ہیں۔ میں آپکو اسکی ہزاروں مثالیں دے سکتا ہوں۔ وہ میرٹ پر عمل برائے نام یا مجبوراً صرف اس طبقہ کے لیے استعمال کرینگے جن سے انکے اقتدار کو کسی قسم کا خطرہ نہ ہو۔ وہ ایک تعلیمی درسگاہ کا انتظامی سربراہ تو شائد کسی دفتری بابو کے ترتیب دیے ہوئے میرٹ پر لگا دیں۔ مگر یہ وزارت اعلیٰ یا وزارت عظمیٰ کو کبھی بھی اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دینگے! میری بات کی تصدیق ہماری سیاسی زندگی کے المناک اتار چڑھاؤ سے

ہو جائیگی۔ ہمارے قائدین مرجائینگے مگر اقتدار کی مسند پر اپنے خاندان کے علاوہ کسی اور کو نہیں بیٹھنے دینگے۔ مغربی ممالک کی ترقی اور ہماری بدقسمتی میں بس اس جزو کا فرق ہے۔ ورنہ لوگ تو تمام ملکوں کے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ مگر سیاسی قائدین کے اس جہان ظلم میں سانس لینے پر مجبور ہمارے عام آدمی امید کے وہ چراغ ہیں جو زندگی کے دیے کو ہمیشہ جلائے رکھتے ہیں۔

لندن میں "آموس ٹرسٹ" انسانی حقوق کی ایک تنظیم ہے۔ اس ٹرسٹ میں لوگ کسی منافع یا کسی لالچ کے بغیر صرف خدمت خلق کرتے ہیں۔ آموس ٹرسٹ نے 2010 میں ایک انتہائی عجیب وغریب فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کی مثال 2010 سے پہلے دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ اس ٹرسٹ نے بغیر گھر کے حد درجہ غریب بچوں کو یعنی "سٹریٹ چلڈرن"، کو اپنی توجہ کا مرکز بنالیا۔ گلیوں میں زندہ رہنے والے لاوارث بچے جو سڑک کے فٹ پاتھ پر پیدا ہوتے ہیں اور فٹ پاتھ پر ہی دم توڑ دیتے ہیں، آموس ٹرسٹ کے ہیرو تھے۔ "سٹریٹ چلڈرن ورلڈ کپ" شروع کیا گیا۔ فٹ بال کے اس کپ میں صرف گلیوں میں پلنے والے بچوں کو حصہ لینے کی اجازت تھی۔ شرط صرف یہ تھی کہ کھلاڑی میچ کے وقت 14 سے 16 سال کا ہو۔ اسکو کسی قسم کی کوئی خاندانی سپورٹ نہ ہو اور وہ پوری عمر لاوارث رہا ہو۔ 2010 میں اس نوعیت کا پہلا ٹورنامنٹ ڈربن یونیورسٹی ساؤتھ افریقہ کے گراؤنڈ میں کھیلا گیا۔ 2010 میں فٹ بال کے اس عظیم میچ میں برازیل، یوکرین، ساؤتھ افریقہ، تنزانیہ، انڈیا اور فلپائن کے بچوں نے حصہ لیا۔ میچ نے فوری طور پر پوری دنیا کی توجہ حاصل کرلی۔ بلکہ یہ میچ بین الاقوامی لاوارث بچوں کے لیے ایک مہم کی شروعات بن گیا۔ دنیا میں فٹ بال کے بہترین کھلاڑی اس میچ کو دیکھنے کے لیے پہنچ گئے۔ وہ کھلاڑی جو اپنے کھیل کی بنیاد پر اربوں روپے سالانہ کماتے تھے، ان بچوں کے لیے کوچ اور ریفری بننا باعث عزت گردانے لگے۔ اس اچھے کام کو شروع یا جاری رکھنے میں کسی بھی مسلمان ملک نے تعاون نہیں کیا۔ شائد 2010 میں مسلمان ممالک میں کوئی بھی نادار اور لاوارث بچہ نہیں تھا۔ بی بی سی نے اپنا ایک چینل اس میچ کو دکھانے کے لیے مختص کردیا۔ اس میں شامل تمام ٹیموں کو بین الاقوامی ہیرو کا درجہ دے دیا گیا۔

میچ کے بعد ڈربن اعلانیہ جاری کیا گیا۔ اس میں کہا گیا کہ لاوارث بچوں کو بھی بولنے کا حق حاصل ہے۔ انکے حقوق کی ہر قیمت پر حفاظت ہونی چاہیے۔ انکو جسمانی اور ذہنی اذیت سے محفوظ رکھنا چاہیے۔ انکے پاس صحت اور تعلیم کے یکساں مواقع ہونے چاہیے۔ انکو باعزت زندگی گزارنے کا مکمل حق حاصل ہونا چاہیے۔ بے گھر اور لاوارث لڑکیوں نے ڈربن اعلانیہ کے بعد ایک منشور پیش کردیا۔ اسکا عنوان تھا۔ "میں بھی ایک لڑکی ہوں"۔ ڈربن کی ٹورنامنٹ میں ہر ٹیم میں تین لڑکیاں بھی مدعو تھیں۔ ان تمام بچوں اور بچیوں کو منتظمین نے آرٹ تخلیق کرنے کی دعوت بھی دیدی۔ انہوں نے آرٹ کے حیرت انگیز نمونے بناڈالے۔ انکی قابلیت اور اہلیت سے مکمل مرعوب ہوکر کیمرج یونیورسٹی نے ایک نمائش منعقد کی۔ لوگ انکی تصویریں دیکھ کر عش عش کر اٹھے۔ نمائش سے نکلتے ہوئے ہر شخص کی آنکھ میں آنسو تھے۔ کیونکہ ان بچوں نے اپنی پوری زندگی میں کسی قسم کی کوئی خوشی نہیں دیکھی تھی۔ یہ محرومی کی مجسم تصویر تھے۔ فیصلہ کیا گیا کہ فیفا ورلڈ کپ سے پہلے ان بچوں کا میچ باقاعدگی سے منعقد کروایا جائیگا۔

2014 اپریل میں بچوں کا یہ نایاب فٹبال ورلڈ کپ برازیل کے شہر ریوڈی جنیرو میں منعقد ہوا۔ اس میں انیس ممالک سے تعلق

رکھنے والے گلیوں میں مقیم بچے شامل ہوئے۔ اس میں پہلی بار پاکستان کی ٹیم نے بھی شرکت کی۔ کراچی کی ایک سماجی تنظیم "آزاد فاؤنڈیشن" نے کمال کام کر ڈالا۔ فاؤنڈیشن نے سخت ریاضت کر کے ان بچوں کو تلاش کیا جو فٹبال کھیلنے کا شوق رکھتے تھے اور باقی شرائط پر بھی پورے اترتے تھے۔ کراچی کی گلیوں میں رلنے والے نایاب ہیرے تلاش کیے گئے۔ کوئٹہ کا ایک بچہ فیضان فیاض بھی اس ٹیم کا حصہ بن گیا۔ فاؤنڈیشن کے کوچ رشید نے ان تمام بچوں کو تین ماہ کے لیے انتہائی سخت تربیت کے مراحل سے گزارا۔ فٹبال کھیلنے کے لیے یہ نو بچے ٹریننگ کے بعد تبدیل ہو گئے مگر کوچ رشید بھی مکمل طور پر تبدیل ہو گیا۔ ان بچوں نے اسکے ذہن کو مکمل بدل کر رکھ دیا۔ پاکستان کی سرکاری فٹبال ایسوسی ایشن نے اس پورے معاملے میں کسی قسم کی کوئی مدد نہیں کی۔ اسکے بعد ایک سرکاری مرحلہ آ گیا۔ اس میں آزاد فاؤنڈیشن اور رشید بے بس ہو گئے۔ وہ تھا پاسپورٹ بنوانا اور پھر برازیل کا ویزہ لگوانے کا مشکل سرکاری کام۔ اکثر بچوں کے پاس کوئی بھی کاغذ نہیں تھا۔ کراچی پاسپورٹ آفس نے انکو خوب ذلیل کیا۔ بالآخر کہیں سے کوئی سفارش کروا کر ٹیم کے پاسپورٹ حاصل کیے گئے۔ ذلت اور بے چارگی کے اسی طرح کے مراحل سے گزر کر ٹیم کے اسلام آباد سے ویزے لگوائے گئے۔ پاکستان کی نادار ترین ٹیم برازیل پہنچ گئی۔

ریوڈی جنیرو میں میچ شروع ہوئے۔ ہماری ٹیم نے معجزے کر ڈالے۔ انہوں نے انڈیا، کینیا اور ماریش کی ٹیم کو فنا کر دیا۔ برازیل کے لوگ پاکستان کی ٹیم کے دیوانے ہو گئے۔ امریکہ کی بہترین ٹیم سے بھی میچ برابر رہا۔ ان بچوں نے چار میچوں میں اٹھارہ گول کر ڈالے۔ پاکستان کی ٹیم کو دیکھنے کے لیے پوری دنیا سے لوگ جمع ہو گئے۔ وہ ہمارے بچوں کو کھیلتا دیکھ کر پاگلوں کی طرح رقص کرنا شروع کر دیتے تھے۔ پوری دنیا کے لوگ ہمارے بچوں کو دیکھ کر پاکستان کے حق میں نعرے لگانے شروع کر دیتے تھے۔ ہماری ٹیم برونڈی سے ہار گئی۔ مگر ہمارے ان بے سہارا بچوں نے بلند کردار کا عظیم مظاہرہ کر ڈالا۔ انہوں نے ہارنے کے بعد برونڈی کے بچوں کی ٹیم کے ساتھ، انکی فتح کا جشن منانا شروع کر دیا۔ سٹیڈیم کے لوگ پاگل ہو گئے۔ ہر طرف "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگنے شروع ہو گئے۔ میچ دیکھنے کے شائقین میں سے اکثر اردو سے نابلد تھے۔ سب لوگ ان بچوں کی خوشی کو دیکھ کر ناچ رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ رو رہے تھے۔

میرا تو مشورہ ہے کہ ان نو بچوں کو پاکستان کے وزیراعظم، وزراء اعلیٰ اور وزراء کی تربیت کر کے انہیں اپنے جیسا بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہوسکتا ہے جہاں سب کچھ فیل ہو گیا، وہاں یہی بچے کامیاب ہو جائیں! یہ بے روزگار، نادار، ان پڑھ اور ماں باپ کے بغیر زندہ رہنے والے بچے ہماری قوم کی عظمت کا نشان ہیں! انہوں نے وہ کام کر ڈالا جو پاکستان کے لیے کوئی بھی نہیں کر سکتا! یہ ہمارے شہروں کا اندھیرا نہیں بلکہ یہ تو سورج ہیں! ہماری تنگ اور تاریک گلیوں کے سورج!

راؤ منظر حیات

Dated:11-07-2014